بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان کے اس پرچہ کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی۔ اور ہم کو نہایت افسوس ہے کہ اس تاخیر سے رسالہ کی اس باقاعدگی میں خلل پڑگیا جس کو ایک سال سے ہم مشکلات کے باوجود نباہ رہے تھے اور جس کو برابر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راقم سطور کو ادھر بعض تعلیمی و تبلیغی کاموں کے سلسلہ میں مرکز سے باہر جانا پڑا اور اس میں پورا مہینہ صرف ہوگیا۔ مرکز سے غیر حاضری کی جرأت اس وجہ سے کی گئی کہ امیر جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی گردہ کے اپریشن سے فارغ ہوکر مرکز میں تشریف لاچکے تھے اور توقع تھی کہ اب ان کی صحت اس قابل ہوچکی ہے کہ وہ تمام کاموں کو سنبھال سکیں گے۔ لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ ابھی وہ لکھنے پڑھنے کا کام شروع بھی نہ کر پائے تھے کہ ان کے اس گردہ میں درد اٹھا جس کا اپریشن ہوا تھا اور درد کی نوعیت ایسی تھی کہ اس طرح کے درد کا گردہ کی اس طویل بیماری کے سلسلہ میں ان کو اس سے پہلے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ مجبوراً پھر ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا۔ ڈاکٹر نے اکسرے کا مشورہ دیا۔ اکسرے سے دریافت ہوا کہ گردہ میں پھر پتھریاں بننی شروع ہوگئی ہیں اور تین پتھریاں چنے کے دانوں کے برابر کی بالفعل موجود ہیں۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اکسرے کے اس انکشاف کا اس مریض پر کیا اثر ہوا ہوگا جس کو ابھی اپریشن کے کمرے سے نکلے ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہ گذرا ہو اور جس کے گردہ سے ایک دو نہیں بلکہ چھوٹی بڑی پانچ پتھریاں نکالی جاچکی ہوں۔ قدرتی طور پر اس چیز کا اثر مولانا پر بہت سخت ہوا۔ مرض کی تکلیف نے ان کے جسم کو بھی مضمحل کیا اور اس کے احساس نے ان کے دماغ اور اعصاب پر بھی اثر ڈالا اور اب وہ پھر اسی طرح مریض اور زیر علاج ہیں جس طرح اپریشن سے پہلے تھے اور ان کی بیماری سے دفعتہً وہ سارے کام پھر تعطل اور التوا میں پڑگئے جن کے شروع ہونے کی توقع پیدا ہوچلی تھی۔

اگرچہ وقت کے حالات کے تقاضے بہت کچھ تھے اور اس تحریک کے سلسلہ میں اندر اور باہر سے آگے کے قدم کے لیے نئے مطالبات پوری قوت کے ساتھ شروع ہو گئے تھے لیکن امیر جماعت کی اس بیماری کی وجہ سے اس اثنا میں ہماری کوشش صرف یہی ہے کہ کسی طرح جماعت کے چلتے ہوئے کاموں کو جوں توں سنبھالے رکھنے کی کوشش کی جائے اور دعوت کے بنیادی کاموں کو مضبوط کیا جائے تاکہ آئندہ جو قدم بھی اٹھے وہ کمزور نہ اٹھے۔ ہم کو اس کوشش میں کامیابی ہوئی یا نہیں اور اگر ہوئی ہے تو کس حد تک ہوئی ہے اس کا بہتر اندازہ ہم سے زیادہ دوسرے کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحالات موجودہ یہ زیادہ سے زیادہ ہے جو ہم کر سکے ہیں اور جب تک امیر جماعت پوری طرح صحتیاب ہو کر سارے کاموں کو خود سنبھالنے کے قابل نہ ہو جائیں اس وقت تک ہم ہیچ کاروں سے اگر اتنا ہی بن آئے کہ ہم بنے ہوئے کاموں کو بگاڑ نہ دیں تو ہم سمجھیں گے کہ ہم اپنے ضعف ہمت کے باوجود توفیق الٰہی سے محروم نہیں رہے اور اگر کام کو آگے نہ بڑھا سکے تو کم از کم اتنا تو کر سکے کہ اس کو گرنے سے بچا سکے۔ جو رفقاء اور مخلصین اس کام میں ہمارے ساتھ شریک ہیں ان سے درخواست ہے کہ ہماری اس مجبوری اور پریشانی پر نگاہ رکھیں اور اللہ تعالیٰ سے برابر دعا کریں کہ وہ مولانا کو اس بیماری سے نجات دے اور اقامت دین کے جس جہاد کے لیے ہم اٹھے ہیں اس کے لیے ہمیں وہ ہمت و قوت اور صحت عطا فرمائے اور پست ہمت اور کمزور ہونے سے محفوظ رکھے۔

اس سفر کے دوران میں بعض رفقائے جماعت اور دوسرے مخلصین سے یہ معلوم ہوا کہ بعض علمی و دینی حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہم خدانخواستہ ملک کے دینی و مذہبی مراکز کے ارباب حل و عقد اور ان کے دوسرے کارکنوں سے ملنے جلنے میں کوئی عار محسوس کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ ان سے مل کر اور بالمشافہہ گفتگوئیں کر کے استمالت و محبت سے ان کو اس دعوت سے قریب کریں، چاہتے ہیں کہ قلم اور زبان کے زور سے ان کو مرعوب اور اس دعوت کو قبول کرنے پر مجبور کریں۔ مجھ کو یہ بھی بتایا گیا کہ ہمارے اس طرز عمل کی وجہ سے بعض حلقوں میں اچھی خاصی غلط فہمیاں

پیدا ہو چکی ہیں اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے ایسے حضرات بھی جو اس دعوت سے قریب تر ہیں ہماری بیگانہ وشی اور بے پروائی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اس سے دور ہو جائیں بلکہ عجب نہیں کہ بدگمان ہوتے ہوتے اس کے خلاف ایک نفرت میں مبتلا ہو جائیں اور مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جن دوستوں نے ان حالات کی خبر دی ہے ان کا ذاتی تاثر بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ وہ ہرچند ہماری اس روش کو کسی غرور پر مبنی نہیں سمجھتے لیکن یہ محسوس کرتے ہیں کہ واقعہ کی حیثیت سے یہ موجود ہے اور یہ بات اس دعوت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے جس کو لے کر ہم اٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس دعوت کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کے کم از کم مذہبی بزرگوں کی خدمت میں حاضری دی جائے اور ان سے اس کام میں شرکت کی درخواست کی جائے اور اگر ان کے اندر اس کے خلاف کچھ بدگمانیاں ہوں تو ان کو خوبصورتی کے ساتھ رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کا کم سے کم فائدہ یہ ہوگا کہ اگر وہ اس کو قبول نہ کریں گے تو اس کی مخالفت بھی نہیں کریں گے۔ اور یہ فائدہ کوئی معمولی فائدہ نہیں ہے۔ جن کے تصرف میں لاکھوں بندگان خدا کے دلوں کے کھولنے اور بند کرنے کی کلید ہو ان سے ایک داعی حق جماعت کی یہ بے نیازی کسی طرح قرین مصلحت نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ کی مزاحمتیں پیدا ہوں گی جن کو دور کرنے کے لیے بعد میں بڑی قوت صرف کرنی پڑے گی اور پھر بھی شاید کچھ اچھا نتیجہ نہ نکلے

اس بارہ میں یہ گذارش ہے کہ اس میں شبہہ نہیں کہ جہاں تک اس ملک کے مذہبی و سیاسی بزرگوں سے ملاقاتوں اور بالمشافہہ تبادلۂ خیالات اور ازالۂ شبہات کا تعلق ہے ہم نے اس سلسلہ میں اب تک کوئی باقاعدہ اور منظم کوشش نہیں کی ہے لیکن اس کا سبب استکبار اور غرور نہیں ہے جیسا کہ سمجھا گیا ہے۔ دلوں کی چھپی ہوئی بیماریوں کا حال تو صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے لیکن ہم جہاں تک اپنے باطن کو ٹٹول سکے ہیں اس کے اندر دوسری کمزوریاں تو پاتے ہیں لیکن الحمد للہ غرور کا کوئی شائبہ نہیں پاتے۔ اور اگر اس بیماری کا کوئی ادنیٰ اثر بھی ہمارے اندر موجود ہو تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اس سے ہمارے دلوں کو پاک کر دے۔ ہم اس روگ کو اپنے اندر پالنے کی ہرگز

ئی خواہش نہیں رکھتے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو استکبار سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں ہے۔ یہ بیماری جن لوگوں کے اندر موجود ہوتی ہے وہ نہ تو حق کو قبول کر سکتے اور وہ نہ حق کو پیش کرنے ہی کی صلاحیت رکھتے اور اگر کوئی جماعت اس بیماری کو لیے ہوئے دعوت حق کے میدان میں اترے تو وہ پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھائے گی اور کوئی طاقت بھی اس کو گرنے سے بچا نہ سکے گی۔ ان باتوں کو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ تاہم شیطان کے فتنوں سے ہم غافل نہیں ہیں اس وجہ سے برابر اپنا احتساب کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے استعاذہ بھی کرتے رہتے ہیں اور اسی بات کی نصیحت ہم ان بزرگوں کو بھی کرتے ہیں بشرطیکہ اس نصیحت کو خیرسگالی پر محمول کیا جائے نہ کہ زور پر۔ اس نصیحت کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوتی ہے کہ بسا اوقات آدمی کسی کو مغرور فرض کر کے اس کے غرور کو توڑنے کے لیے خود غرور کی روش اختیار کر لیتا ہے حالانکہ اُس کا غرور محض فرضی ہوتا ہے اور اِس کا حقیقی۔ شائد مشہور حکیم دیوجانس کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ سکندر کے دربار میں گیا اور وہاں جاکر اس نے دربار کے قیمتی قالینوں کو اکڑ اکڑ کر پامال کرنا شروع کیا۔ سکندر نے یہ منظر دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا دیوجانس یہ کیا؟" دیوجانس نے جواب دیا "تیرے غرور کو پامال کرنے کے لیے ایسا کر رہا ہوں"۔ سکندر نے کہا "ہاں مگر میرے غرور سے بڑے غرور سے"۔ یعنی آپ پامال تو کر رہے ہیں میرے غرور کو مگر پامال کرنے کے لیے ذریعہ بنایا ہے غرور ہی کو اور یہ غرور میرے غرور سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح ہم کو اندیشہ ہے کہ جو لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہم مغرور ہیں اور اس کی وجہ سے وہ ہماری باتوں کو لائق التفات نہیں سمجھتے مبادا وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں جس میں دیوجانس جیسا حکیم مبتلا تھا اور باایں ہمہ دانش و حکمت اس کو اپنی اس بیماری کا اس وقت تک پتہ نہیں چلا جب تک سکندر جیسے ایک "دنیا دار" نے اس پر تنبیہ نہیں کی۔

بہرحال اگر کسی بزرگ کو ہماری نسبت یہ بدگمانی ہو کہ ہم کبر و غرور میں مبتلا ہیں اس وجہ سے اس دعوت کو پیش کرنے کے لیے ہم ان کی خدمت میں حاضری نہیں دیتے تو ہم صفائی سے عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اس بدگمانی کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور اگر خدانخواستہ اس بدگمانی کے

سبب سے وہ ایک دعوت حق کا ساتھ دینے سے محروم رہتے یا اس کے خلاف اپنے دلوں میں بدگمانیوں کی پرورش کرتے رہے یا ضد اور عناد میں مبتلا ہو کر اس کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آئے تو ان ساری باتوں کی ذمہ داری ہم پر عاید نہیں ہو گی بلکہ خود ان پر عاید ہو گی اور اگر وہ ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو انھیں خود محسوس ہو گا کہ درحقیقت ان کا اپنا نفس ہے جو ان کو اس عناد و اختلاف پر اکسا رہا ہے نہ کہ ہمارا۔

ہم نے مذہبی و دینی گروہوں کے معاملہ میں اب تک جو روش اختیار کی ہے اس کی بنیاد درحقیقت حسن ظن اور اعتماد پر ہے نہ کہ کبر و غرور پر۔ اس دعوت کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے مختلف طبقات کا حال مختلف قسم کا ہے اور اسی کے اعتبار سے ہم نے ہر طبقہ سے متعلق اپنے رویہ کا تعین کیا ہے۔ اگرچہ اس بات کا امکان ہے کہ ہم نے اس رویہ کے تعین میں غلطی کی ہو لیکن ہم پر اب تک اپنے اس رویہ کی غلطی واضح نہیں ہوئی ہے اس وجہ سے ہم نے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ ہمارے سامنے سب سے مقدم سوال مسلمانوں کے اس تعلیم یافتہ طبقہ کا تھا جو پوری طرح انگریزی تہذیب و تمدن کے زیر اثر فکر اور عمل دونوں میں اسلام سے بہت دور ہٹ گیا تھا اور بدقسمتی سے یہی گروہ تھا جس کے ہاتھ میں آج عملاً مسلمانوں کی قیادت کی باگ تھی۔ اس گروہ کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم نے اپنے لٹریچر کے ذریعہ سے بھی اور اپنی انفرادی و اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ سے بھی پہلے اس بات کی کوشش کی کہ جن نظریات و افکار سے یہ گروہ مرعوب ہے ان کی ہیبت اس کے دلوں سے دور ہو اور وہ اسلام کو سمجھے اور اسلامی نظام زندگی کو اپنانے کی طرف مائل ہو۔ دوسرا طبقہ ان مسلمانوں کا تھا جو ہر قسم کی تعلیم سے بالکل بے بہرہ اور اسلام اور اسلامی عقائد کے مقتضیات سے بالکل ناواقف ہے۔ اس گروہ کے لیے ہم اپنے رفقاء اور ارکان اور اپنے اجتماعات اور تبلیغی دوروں کے ذریعہ سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے اندر اسلام کے حدود و شرائط اور اس کے مقتضیات و مطالبات کا شعور پیدا ہو اور الحمدللہ اس سلسلہ میں ہمارا کام ایک حد تک منظم ہو گیا ہے اور اچھے نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ تیسرا طبقہ علماء و مشائخ اور دینی اداروں کے ارباب حل و عقد اور ان کے کارکنوں کا ہے۔ ہر چند ہم اس طبقہ سے بے پروا نہیں رہے ہیں بلکہ مختلف طریقوں

ہم نے ان سے قریب ہونے کی کوشش برابر جاری رکھی ہے ــــ بعض حضرات سے ہم نے خود ملاقاتیں کرکے ان کے سامنے اپنے مقصد کو پیش کیا ہے، بعض دینی اداروں میں خود پہنچکر لوگوں کو اس فرض کی طرف توجہ دلائی ہے، بہت سے حضرات کی خدمت میں اپنا پورا لٹریچر اپنے خاص رفقاء کے ذریعہ سے ہدیۃً بھیجا ہے اور ان سے اس کے مطالعہ کی درخواست کی ہے، بعض اکابر کی خدمت میں اپنے خاص ارکان کو بالمشافہ تبادلہ خیالات کے لیے بھیجا ہے۔ بعض حضرات جنھوں نے ہمارے کاموں پر اعتراضات کیے ہیں ہم نے اپنے علم وفہم کے مطابق ان کے شبہات واعتراضات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے ــــ تاہم یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کہ ان تمام حضرات میں سے ہر ایک کی خدمت میں حاضری کی سعادت ہم کو حاصل نہیں ہوئی ہو لیکن حاشا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ رہے ہیں اور ان لوگوں کی خدمت میں حاضر ہونا کوئی کسر شان سمجھتے ہیں بلکہ اس کا اصلی سبب جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ حسن ظن اور اعتماد ہے جو ان بزرگوں کے علم وفضل کی بنا پر ان کے ساتھ ہم نے قائم کیا تھا اور جو اب تک قائم ہے۔

ہمارے اس حسن ظن کی بنا یہ تھی کہ ہم خیال کرتے تھے کہ جس دین کی اقامت کی دعوت ہم نے شروع کی ہے وہ دین جس طرح ہم کو عزیز ومحبوب ہے اسی طرح ان حضرات کو بھی عزیز ومحبوب ہے۔ اس دین کے مقتضیات ومطالبات کو جس طرح ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کے اصلی ماخذوں سے معلوم کیا ہے اسی طرح یہ حضرات بھی اس کے تمام ماخذوں سے آگاہ اور اس کے مقتضیات ومطالبات سے باخبر ہیں۔ جس طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ نام کے مسلمان کام کے مسلمان بنیں اسی طرح یہ حضرات بھی یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں دین کا صحیح شعور پیدا ہو اور وہ اسلام کے راستہ پر چلیں۔ ہمارے خیال میں یہ تمام دینی مدارس تمام درسگاہیں، تمام دارالعلوم اور تمام خانقاہیں اسی لیے قائم ہیں کہ ان کے ذریعہ سے خدا کا دین سربلند ہو۔ پھر ہم یہ بھی جانتے تھے کہ یہ زمانہ نشر واشاعت کا زمانہ ہے۔ ہر طرح کی چیزیں چھپتی اور شائع ہوتی ہیں اور وہ جس طرح ہر جگہ پہنچتی ہیں اسی طرح ہمارے دینی اداروں اور مذہبی مرکزوں میں بھی پہنچتی ہیں، اور

علما و طلبہ اور اکابر و مشائخ سب ان کو پڑھتے سمجھتے اور ان پر رائیں قائم کرتے ہیں۔ پھر اس بات کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جہاں سب کچھ پڑھا اور سمجھا جاتا ہو وہاں ہماری ہی چیزیں لوگوں کی توجہ سے محروم رہ جائیں گی بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ یہ اسی مقصد کی دعوت دے رہی ہیں جس مقصد کے عشق کے یہ حضرات خود دعویدار ہیں۔

معاملہ کی اس نوعیت کی وجہ سے قدرتی طور پر اس گروہ کے متعلق ہمارا ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ جس مقصد کی طرف ہم دعوت دے رہے ہیں یہ مقصد ہمارے اکیلے کا نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا اور ان کا ایک مشترک مقصد ہے جس کے لیے وہ بھی وہی جوش و سرگرمی رکھتے ہیں جو جوش و سرگرمی ہم رکھتے ہیں ہم نے ان کو اس سے بیگانہ نہیں خیال کیا کہ ان کو آشنا کرنے کی ضرورت ہو، اس سے جاہل اور بے خبر نہیں سمجھا کہ ان کی تعلیم کا اہتمام کریں، اس سے منحرف اور بیزار نہیں پایا کہ اس کی طرف کھینچنے اور لانے کی ضرورت محسوس کریں، اس کا منکر اور مخالف نہیں دیکھا کہ ان کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔ زیادہ سے زیادہ ہم جو کچھ گمان کر سکتے تھے وہ یہ تھا کہ دین کے دوسرے جزوی معاملات و مسائل نے ان حضرات کو اس قدر اپنی طرف جذب کر رکھا ہے کہ اصل فرض کی اہمیت سے یہ غافل ہو گئے ہیں۔ اس غفلت کو دور کرنے کے لیے یہ بات کافی تھی کہ ہم اس فرض کی اہمیت کو پوری طرح واضح کر کے ان کے سامنے رکھ دیں۔ یہ کام ہم نے کر دیا۔ اور اس کے بعد ہم دو ہی باتوں کے ان سے متوقع ہو سکتے تھے۔ یا تو یہ سمجھیں گے اس بات کے کہ وہ اس فرض کی اہمیت کو سمجھ کر اس کے لیے اپنی توجہ اور سرگرمی کا وہ حصہ مخصوص کریں گے جس کا وہ مستحق ہے یا اگر ہماری بات میں کوئی غلطی محسوس کریں گے تو اس سے متنبہ کریں گے۔ یہ تو کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ حضرات ہماری بات کی تصدیق بھی کریں گے اور اس سے بیزار بھی رہیں گے اور اس بیزاری کی وجہ یہ ہو گی کہ ہم نے ان میں سے ہر ایک کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے اس دعوت کی سرپرستی کے لیے درخواست کیوں نہیں کی۔

جہاں مشترک مقصد کا سوال ہو وہاں اس طرح کی ذہنیت کا پیدا ہونا تعجب انگیز بھی ہے اور مایوس کن بھی اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس گروہ کو وقت کی اسلامی سوسائٹی کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے اس کے فکر و عمل کا اسلامی روح کے لحاظ سے کیا حال ہے! یہ کوئی ہماری اپنی ذاتی تقریب نہیں تھی کہ اس کی شرکت کے لیے ہم ایک ایک کو بلا وا بھیجتے تب ہی لوگ اس میں شریک ہوتے۔ نہ ہم نے لڑکے کا ولیمہ کیا ہے نہ لڑکی کا نکاح کہ جن اصحاب کو دعوت دی گئی ہے وہ تو شریک ہوں اور جن کو دعوت نہیں دی گئی ہے وہ روٹھ کے بیٹھ رہیں اور اس وقت تک روٹھے رہیں جب تک برادری کے رسوم کے مطابق ہم اس جرم کی تلافی نہ کر دیں۔ اجتماعی اور مشترک مقاصد کے لیے ہر اللہ کے بندہ کو حق ہے کہ وہ دعوت دے اور ہر وہ شخص جس میں اس اجتماعی مقصد کی اہمیت کا احساس ہے اس کا حق ہے کہ اس دعوت پر لبیک کہے۔ نہ اس طرح کے مقاصد کے لیے دعوت دینا کسی خاص گروہ کا اجارہ ہے اور نہ اس طرح کی دعوتوں کو قبول کرنے میں کسی کے لیے کوئی پہلو شرم اور ذلت کا ہے۔

ایک موذن اذان دیتا ہے اور محلہ کے وہ سارے مسلمان اس کی صدائے حی علی الصلوٰۃ پر جمع ہو جاتے ہیں جو نماز کے اوقات، اس کی فرضیت، اس کی اقامت اور جماعتی صورت میں اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اذان کی صدا کے بعد نہ موذن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دروازہ دروازہ لوگوں کو جگاتا پھرے اور نہ نمازیوں ہی کے لیے یہ زیبا ہے کہ حی علی الصلوٰۃ کی پکار سننے کے بعد وہ اس سے اس بات کے متوقع ہوں کہ وہ ان کو جگائے گا بھی، ان کے لیے وضو کا پانی بھی رکھے گا، ان کی مسواک اور ان کی تسبیح بھی تلاش کر کے لائے گا اور ان کی جا نماز بھی بچھائے گا۔ یہ سارے کام داعی اور موذن کے کرنے کے نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں کے خود کرنے کے ہیں جو نماز کی فرضیت اور دین میں اس کی اہمیت کو جانتے ہیں۔ یہ سارے جتن ایک داعی اگر کرتا بھی ہے تو ان لوگوں کے لیے نہیں جو نماز کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے کرتا ہے جو نماز کے فوائد و برکات سے نا آشنا ہیں اور صرف اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کو ادائے فرض کے وقت سے

آگاہ کر دیا جائے بلکہ ساتھ ہی اس بات کے بھی محتاج ہیں کہ ان کو بچوں کی طرح اس فرض کی طرف پیار اور محبت سے لایا بھی جائے۔

ہم نے ان مذہبی بزرگوں کو اب تک نہ بچوں اور غافلوں کے درجہ میں رکھا ہے اور نہ منکرین اور مخالفین کے درجہ میں اس وجہ سے ان کے بارہ میں ہماری روش یہ رہی ہے کہ ہم اذان دے کر، جہاں تک ان کا تعلق ہے، اپنی ذمہ داری سے اپنے تئیں سبکدوش سمجھتے رہے ہیں اور ان کی طرف سے ان کے شایان شان جواب کے منتظر رہے ہیں لیکن اب جبکہ ہمارے باخبر احباب و مخلصین ہم کو بتاتے ہیں کہ ہماری طرف سے اسی قدر کافی نہیں ہے کہ ہم ان کو فرض سے آگاہ کر دیں بلکہ اس کے ماسوا اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ استمالت اور لجاجت سے ان حضرات کو اس فرض کی طرف لائیں بھی تو ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم یہ سب کچھ بھی کر دیکھیں گے۔ اس میں ہمارے لیے کوئی شرم اور ذلت کی بات نہیں ہے بلکہ خود ان حضرات ہی کی دینداری اور خدا ترسی کی تحقیر ہے جو خدا کا فرض بھی اس وقت تک ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں کر سکتے جب تک ہم سے اپنے نفس کا حق وصول نہ کر لیں۔ ہم تو خدا کے دین کے داعی ہیں اور اس کام کو اسی طریق پر انجام دینا چاہتے ہیں جس طریق پر خدا کے ان بندوں نے اس کو انجام دیا ہے جن کو خدا نے اس کام پر مامور کیا تھا۔ ہم اچھی طرح آگاہ ہیں کہ اس راہ میں سب سے پہلی چیز نفس کی انانیتوں کی قربانی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس علم کے باوجود انانیت اور کبر نفس کا کوئی شائبہ لیے ہوئے اس میدان میں اتر آئے ہوں اس وجہ سے ہمارا ان سے زیادہ خیر خواہ کوئی نہیں ہو سکتا جن کا طرز عمل ہمیں اس نجاست سے پاک ہونے پر مجبور کر دے۔ البتہ وہ لوگ خود اپنے لیے فیصلہ کر لیں کہ ان کے لیے بہتر کیا ہے کیا یہ کہ ہم ان کی جوتیاں سیدھی کر کے ان کے نفس کی خواہش پوری کر دیں اور ان پر حق کی حجت تمام کر دیں یا یہ کہ وہ بغیر کسی ابا کے حق کا مطالبہ پورا کر دیں اور اپنے علم اور تقویٰ کی لاج رکھ لیں؟